اب میرا انتظار کر

17 جنوری

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

تمہاری شادی کے بعد انگلینڈ سے بھیجا ہوا تمہارا پہلا خط مجھے آج ہی ملا ہے۔ فاصلے دلوں کے رابطوں کو اور مضبوط کر دیتے ہیں۔ یہ تم نے ہی کہا تھا ناں (کاش ایسا نہ ہوتا) سات سال کی طویل دوستی کے بعد اب تم اتنی دور جا بیٹھی ہو کہ مجھے اپنے اردگرد کے لوگوں میں تمہارے جیسا چہرہ تلاش کرنے میں بہت دیر لگے گی۔ (شاید مجھے کبھی بھی تمہارے جیسا کوئی دوسرا نہ ملے)

پتا نہیں مجھے یہ احساس کیوں ہونے لگا ہے کہ میں آہستہ آہستہ سب کچھ کھو دوں گی۔ کچھ پہلے کھو دیا۔ کچھ اب کھو رہی ہوں جو باقی بچا ہے وہ بھی کب تک رہے گا۔ پھر خالی ہاتھ اور خالی دل کے ساتھ میں کہاں جاؤں گی۔ اب تو رونے کے لیے تمہارا کندھا بھی نہیں ہے۔ نہیں پریشان مت ہونا۔ میں رو نہیں رہی ہوں۔ کوشش کر رہی ہوں۔ تمہاری ہدایات پر عمل کرنے کی اور تم سے کیے ہوئے وعدہ نبھانے کی۔

تم نے خط میں پوچھا تھا۔ میں کیسی ہوں۔ کیوں مریم تم نے ایسا کیوں لکھا' پہلے تو کبھی تم نے اپنے کسی خط میں مجھ سے میرا حال نہیں پوچھا پھر اب کیوں؟ کیا تمہیں لگ رہا ہے کہ ..... میں ٹھیک ہوں میں اچھی ہوں بہت ہی خوش ہوں' اتنی ہی خوش ہوں جتنا آج کے دور میں میری جیسی لڑکی ہو سکتی ہے۔

اپنے خط میں یہ مت پوچھنا کہ میرے جیسی سے تمہاری کیا مراد ہے۔ میری باتیں تمہیں ابنارمل لگ رہی ہیں' میں واقعی آج کل ابنارمل ہو رہی ہوں۔ تم نے کبھی دلدل میں پھنسے ہوئے شخص کو دیکھا ہے۔ کیسے ہاتھ پاؤں مارتا ہے وہ۔ کوئی رشتہ' کوئی اثاثہ' کوئی دولت بچانے کے لئے نہیں بس ایک جان بچانے کے لیے۔ میں بھی پچھلے کئی سالوں سے ایک دلدل میں پھنسی ہوئی ہوں' بس فرق یہ ہے کہ میں' میں ہاتھ پاؤں نہیں مار رہی ہوں۔ جان بچا کر آخر کرنا ہی کیا ہے۔ میرا خط پڑھتے ہوئے رونا مت شروع کر دینا۔ میں تمہیں پریشان کرنے کے لیے یہ سب کچھ نہیں لکھ رہی ہوں۔ تمہیں پتا ہے مجھے اکثر ڈپریشن کے دورے پڑتے ہیں۔ آج بھی ایسا ہی ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہیں بھاگ جاؤں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی پہاڑ پر جا بیٹھوں خاموشی میں سنانے میں اور پھر روؤں زور زور سے دھاڑیں مار مار کر۔ اور میری ہر سسکی' ہر آہ' ہر چیخ پہاڑوں میں گونج بن کر پھرتی رہے۔

(کیا اشفاق احمد اور بانو قدسیہ اس سے زیادہ فلاسفی لکھ سکتے ہیں)

یہ جان کر سکون مل رہا ہے کہ تم ناصر کے ساتھ بہت خوش ہو۔ لیکن مریم! تم ناصر کے ساتھ ہی نہیں کسی بھی شخص کے ساتھ خوش رہ سکتی تھیں۔ تمہیں خدا نے میرے جیسے روگ نہیں دیئے۔ تم نے لکھا ہے ناصر بہت اچھا ہے۔ تمہارا بہت خیال رکھتا ہے۔ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ میری دعا ہے۔ تم ہمیشہ اپنے ہر خط میں یہی تین جملے لکھتی رہو۔ ان میں کبھی تبدیلی نہ آئے۔ ہاؤس جاب چھوڑ کر تم نے اپنے والدین کی خوشی کے لیے اپنا کیریئر قربان کر دیا ہے۔ تمہیں اتنا اجر تو ملنا ہی چاہیے کہ جس شخص کے ساتھ تمہاری شادی ہوتی' وہ تم سے محبت کرتا۔

تم نے میری روٹین اور مصروفیات کے بارے میں پوچھا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے کیا تمہارے بغیر صرف ایک ماہ میں سب کچھ بدل گیا ہے۔ نہیں مریم! سب کچھ ویسا ہی ہے۔ بس خاموشی کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے' پہلے میرے اندر ہی تھی۔ اب آہستہ آہستہ میرے اردگرد بھی پھیلنے لگی ہے۔ ہاسپٹل سے آنے کے بعد کافی کا مگ لے کر اب میں اکیلی اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہوں۔ (پہلے تو تم بھی ساتھ ہوتی تھیں) پھر مجھے بہت کچھ یاد آتا رہتا ہے لیکن میں خاموشی سے کافی کے سپ لیتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکتی

رہتی ہوں۔ (پہلے میں سب کچھ تم سے کہا کرتی تھی)

میں اب اپنا کمرہ کسی سے شیئر نہیں کر سکتی۔ میں تمہاری جگہ کسی کو نہیں دے سکتی۔ ساری شام اس کھڑکی میں اسی طرح گزار دیتی ہوں۔ پھر رات آ جاتی ہے۔ اور اس شخص کی یاد کے ساتھ اب تمہاری یاد بھی شامل ہو گئی ہے۔

بس ایک سال باقی ہے پھر میرے پر کاٹ کر مجھے بھی قفس میں بند کر دیا جائے گا اور مریم! میری دعا ہے۔ یہ سال اتنا لمبا ہو جائے کہ کبھی ختم ہی نہ ہو مگر میرے کہنے سے وقت کی رفتار نہ بڑھے گی نہ تھمے گی اور ایک سال بعد جب میں اپنے خوابوں اور خواہشوں کے تابوت میں آخری کیل گاڑ کر واپس لوٹ جاؤں گی تو تم آنا' سیدہ درمکنون علی عباس رضوی کو دیکھنے...... روحانی طور پر بیمار مسیحا کو جسمانی شفا بانٹتے ہوئے۔ مریم! سال میں تین سو پینسٹھ دن کیوں ہوتے ہیں تین ہزار تین سو پینسٹھ کیوں نہیں۔

مجھے خط لکھتی رہنا۔ کم از کم اس سال تو۔ پھر جب واپس اپنے گاؤں چلی جاؤں تو مجھے کوئی خط نہ لکھنا۔ پھر شاید میں کسی رابطے کے قابل نہ رہوں۔ میں مایوس نہیں ہو رہی۔ حقیقت کو تسلیم کرنا سیکھ رہی ہوں۔ تم ہی نے ایک دفعہ کہا تھا نا۔ ''درمکنون تمہارا مسئلہ حالات نہیں تمہارا رومانٹسزم ہے۔'' خوش ہو جاؤ مریم رومانٹسزم ختم ہوتا جا رہا ہے۔

درمکنون

20 فروری

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

اپنے خط میں اتنی نصیحتیں اور ہدایات مت لکھا کرو۔ میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔ ساری زندگی مجھے نصیحتوں اور ہدایات کے علاوہ دیا ہی کیا گیا ہے۔ اب تم بھی وہی سب کچھ کرنے لگی ہو جو میرے ماں باپ ہمیشہ سے کرتے آ رہے ہیں۔

بار بار خوش رہنے کا کہتی ہو۔ تم بھی تو ڈاکٹر ہو۔ خوش رہنے کے لیے کوئی نسخہ کیوں نہیں تجویز کرتیں یا پھر کوئی دوائی بھیج دو۔ انگلینڈ سے خوشی کے لیے جس کے تین ذرا

بس مجھے خوشی سے مالا مال کر دیں اور اگر ایسا نہیں کر سکتیں تو بس پھر خوش رہنے کے لیے مت کہا کرو' یہ بھی میرے بس میں نہیں۔

تمہاری بھیجی ہوئی چیزیں مجھے مل گئی ہیں مگر اب دوبارہ کچھ مت بھیجنا۔ تم جانتی ہو مریم! یہ سب چیزیں میرے لیے بے کار ہو چکی ہیں مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صرف تمہارے تحریر کیے ہوئے چند لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کل بہت محتاج ہو گئی ہوں۔ ہر چیز' ہر بات کے لیے۔ لوگوں کو میری بات کا مفہوم سمجھنے میں بڑی دیر لگتی ہے۔ اور میں چاہتی ہوں۔ کوئی میری بات سمجھنے کی کوشش کرے ہی نہ۔ وقت کے ضیاع کے اور بھی تو طریقے ہوتے ہیں۔

''مریم! آج میں بہت روئی ہوں۔ تم جانتی ہو کیوں؟ ہاں تم ہی تو جانتی ہو۔ پتا ہے مریم آج پھر عاشر کا خط اور کارڈ آیا ہے۔ اس شخص کو جیسے ہر بات کی خبر ہوتی ہے۔ اسے تمہاری شادی اور انگلینڈ چلے جانے کا بھی پتا چل گیا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم سے جدائی میرے اعصاب پر کس طرح سوار ہو گئی ہے۔ اسے یہ بھی علم ہے کہ تنہائی میرے وجود کو کس طرح پگھلا رہی ہے اور میرا باپ کہتا ہے۔ محبت کوئی چیز نہیں اور میرا دل چاہتا ہے۔ میں اس کے سارے خط ان کے سامنے پھینکوں اور کہوں مجھے جاننا' مجھے سمجھنا ہے تو ان خطوں کو پڑھ کر جانیں۔ ان کو پڑھ کر سمجھیں اور پھر مجھے بتائیں۔ ان کی بیٹی درکنون ان کو کیسی لگتی ہے۔ پتا نہیں ماں باپ کو یہ غلط فہمی کیوں ہوتی ہے کہ ان سے زیادہ ان کی اولاد کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کوئی نہیں جانتا۔ حالانکہ انہیں تو کچھ بھی پتا نہیں ہوتا۔ انہیں ہی تو کچھ پتا نہیں ہوتا۔ انہیں تو صرف ہمارا وجود نظر آتا ہے۔ دو ٹانگوں' دو ہاتھوں' دو آنکھوں اور ایک دماغ والا وجود۔ وہ اسے ہی کُل سمجھتے ہیں یہ کُل کہاں ہے کُل تو دل ہے اور میرے دل تک ساری دنیا پہنچ سکتی ہے بس میرے ماں باپ نہیں پہنچ سکتے۔

پہلے زمانے کے لوگ اچھے تھے۔ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ گاڑ دیتے تھے۔ اب یہ کام آلِ رسول کرتی ہے مگر بیٹیوں کو جوان کرنے کے بعد۔

تم نے لکھا ہے۔ مایوس نہ ہو مایوسی کفر ہے مریم! کیا صرف مایوسی ہی کفر ہوتی ہے اور کوئی چیز نہیں؟ تمہارا کیا خیال ہے جو مایوس نہیں ہوتے۔ وہ پکے اور سچے مسلمان

ہوتے ہیں۔ کیا دوسروں کی آنکھوں کے خواب چھین لینا کفر نہیں ہوتا؟ کیا دوسروں کے دلوں کی خواہشات کو روند دینا کفر نہیں؟ اور مریم! بعض دفعہ مایوسی کفر سے بچا بھی تو لیتی ہے جیسے مجھے بچا رہی ہے۔ بعض دفعہ آسوں' امیدوں کا ختم ہو جانا بھی بڑی نعمت ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ تم اس پیراگراف کو تین دفعہ پڑھو گی اور تمہیں وہ بات سمجھ میں آ جائے گی جو میں نے نہیں لکھی۔

''مریم! تم...... تم خدا کے لیے عاشر سے کہہ دو مجھے خط نہ لکھے۔ مجھے کارڈ نہ بھیجے۔ میری جان چھوڑ دے اس سے کہو سوچ لے کہ درکنون مر گئی ہے مان لے کہ درکنون کبھی تھی ہی نہیں۔ اور بس مجھ سے کوئی رابطہ نہ کرے۔ تم تو کہہ سکتی ہو اس سے۔ مریم تم تو سمجھا سکتی ہو۔ تم اس کے شہر میں ہو۔ اس کے پاس ہو۔ اس سے کہو۔ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ اپنی زندگی تباہ نہ کرے۔ اسے تو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ مریم! تم ایک بار عاشر سے ملو۔ یہ مشکل کام تو نہیں ہے۔ ایک بار میری خاطر اس سے ملو۔ شاید تم اسے وہ سب کچھ سمجھانے میں کامیاب ہو جاؤ جو میں نہیں سمجھا سکتی۔ جو کوئی دوسرا نہیں سمجھا پایا۔

پتا ہے' اس بار اس نے اپنے خط میں کیا لکھا ہے۔ اس نے لکھا ہے۔

''درکنون! تمہیں یہ غلط فہمی کیوں ہے کہ تم میرے بغیر خوش رہ سکتی ہو۔ خوشی تو دور کی بات ہے۔ تم تو زندہ بھی نہیں رہ پاؤ گی؟ ۔''

اور لوگ کہتے ہیں دلوں کے بھید صرف اللہ جانتا ہے' ہے نا مریم! لوگ پھر بھی یہی کہتے ہیں۔ اور میرا دل چاہتا ہے مریم! میں عاشر سے کہوں کہ وہ میرے وجود پر پڑی ہوئی فریب اور ڈھکوسلے کی چادر کو یونہی پڑا رہنے دے۔ یہ خود فریبی جب تک ہے۔ میں ہوں اور جب یہ نہیں ہو گی تو......

وہ اپنے ہر خط میں پتا نہیں کون کون سے اسکالرز کے ریفرنسز دیتا رہتا ہے۔ اسے لگتا ہے' وہ اس طرح مجھے قائل کر لے گا۔ مریم میں کب قائل نہیں ہوں۔ وہ کوئی دلیل کوئی ریفرنس نہ دے تب بھی میں جانتی ہوں۔ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن وہ۔ وہ کیوں میرے پاؤں میں پڑی بیڑیوں کو نہیں دیکھتا۔ وہ چاہتا ہے۔ میں بغاوت کروں۔ میں لڑوں۔ اپنا حق مانگوں۔ اسے نہیں پتا' سید زادیوں کے کوئی حق ہوتے ہی نہیں۔ پھر حق مانگنے اور لینے کا

سوال کہاں سے آتا ہے؟ تمہیں یاد ہے نا وہ کتنا Optimistic (خوش امید) ہوا کرتا تھا۔ وہ اب بھی ویسا ہی ہے اس کا خط کسی بھی لڑکی کو بغاوت پر آمادہ کرسکتا ہے۔ کسی کو بھی چیلنج کرسکتا ہے۔ مگر میں...... میں تو سید زادی ہوں۔ مجھے خوف آتا ہے مریم! کہیں میرا Pessimism (قنوطیت) اس کے Optimism (رجائیت) کو نہ لے ڈوبے پھر وہ اپنی زندگی کیسے گزارے گا۔ دنیا کو میری طرح کالے شیشے کی عینک پہن کر دیکھنا۔ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اور میں نہیں چاہتی۔ یہ تکلیف کبھی اس کی زندگی میں آئے پھر بھی مریم میں کچھ نہیں کرسکتی۔ محبت اس کا قصور تھی میں نے اس سے نہیں کہا تھا کہ مجھ سے محبت کرو۔ یہ سب اس نے اپنی مرضی سے کیا تھا۔

اس وقت بھی مجھے اس کھڑکی سے باہر کھڑے دو گارڈز نظر آرہے ہیں جو میری ''حفاظت'' کے لیے ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔ کس قدر اہم ہوں میں مریم! کس قدر اہم ہوں میں اپنے ماں باپ اپنے خاندان کے لیے۔ مریم حفاظت اور نگرانی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ کیا تم کو پتا ہے۔ مجھے پتا ہے تم نے فلمز میں اکثر تیروں کو جسم چھلنی کرتے دیکھا ہوگا۔ کبھی کسی چہرے کو تیروں سے چھلنی ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

اگر کبھی دیکھنے کی خواہش ہوئی تو میرا چہرہ دیکھنا۔ جو لوگ آپ کی حفاظت کر رہے ہوں' وہ تو آپ کے اردگرد موجود اور آپ کے ملنے والے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ مگر میرے محافظ مجھ سے ملنے والے ہر شخص کا چہرہ پڑھنے کے بجائے میرا چہرہ پڑھتے ہیں۔ (انہیں احکامات پر عمل کرنا ہے) اور تب مریم! تب مجھے یوں لگتا ہے جیسے ایک کے بعد ایک سنسناتا ہوا تیر میرے چہرے میں ترازو ہو جاتا ہے اور میرا چہرہ مسخ ہوتا جاتا ہے اور میں چیخنے چلانے رونے کے بجائے ہنستی ہوں۔ مسکراتی ہوں۔ کیا اس سے زیادہ اذیت ناک چیز کوئی اور ہو سکتی ہے مریم؟

میں اگر سلیپنگ پلز نہ لوں تو شاید اب کبھی سو نہ سکوں۔ لیکن پتا نہیں مریم! اب یہ گولیاں بھی بے اثر ہوتی جارہی ہیں۔ ہر گزرنے والے ہفتے کے ساتھ مجھے ان کی ڈوز ڈبل کرنی پڑ رہی ہے ورنہ میں سو نہیں پاتی۔ مریم! میرے لیے دعا کیا کرو۔ مجھے اپنی دعا نہیں لگتی۔ شاید تمہاری لگ جائے۔ دعا کرو۔ مجھے سکون مل جائے دعا کرو۔ میرا دل دنیا میں

لگ جائے۔ دعا کرو۔ مجھے زندگی کے سارے پھندے اچھے لگنے لگیں۔ دعا کرو۔ اللہ کو بھی بھول کر میرا خیال آجائے۔

خدا حافظ

تمہاری درِ مکنون

12 مارچ

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

یہ خط تمہیں گاؤں سے لکھ رہی ہوں۔ پچھلے چار دنوں سے یہیں ہوں اور یوں لگتا ہے۔ جیسے کسی جہنم میں ہوں۔ بس یہ جہنم بہت سرد ہے۔ یہ جسم کو کچھ نہیں کرتی۔ روح کو مار دیتی ہے۔ مجھے لگتا ہے مریم! میں مردہ روح والی ایک زندہ جسم ہوں۔

میں ساری عمر اسی گھر' اسی حویلی میں رہی ہوں۔ مگر پتا نہیں کیوں مریم! اب مجھے اس گھر سے بہت خوف آتا ہے اور اس خوف کا کوئی علاج نہیں ہے۔ مریم! مجھے بتاؤ۔ میں ساری عمر ان وسیع دالانوں' اونچے برآمدوں کے ساتھ کیسے رہوں گی؟ ان دیواروں کے ساتھ بیس سال بعد اکیلے باتیں کرکے زندگی کیسے گزاروں گی مگر...... مگر مجھے یہیں رہنا ہے۔

پچھلے چار دنوں سے پورے گاؤں کی عورتیں مجھ سے ملنے آرہی ہیں۔

انہیں میں بہت خاص ''ہستی'' لگتی ہوں۔ سید علی عباس رضوی کی پہلی اولاد جو دینی و دنیاوی دونوں علوم سے آراستہ ہے جسے اس لیے اہمیت حاصل ہے کیونکہ وہ اس خاندان کی پہلی لڑکی ہے جو اس طرح ڈاکٹر بننے کے لیے گاؤں سے باہر گئی اور جو اپنے باپ کی گدی سنبھالنے کے بعد روحانی کے ساتھ ساتھ جسمانی مسیحائی بھی کرے گی۔ مگر میں نہیں کروں گی۔

مریم! تم دیکھ لینا میں نہیں کروں گی۔ میں اگر اپنا گھر آباد نہیں کرسکتی تو حجرہ آباد کیوں کروں۔ اپنے دل' اپنی روح کو شفا نہیں دے سکتی تو لوگوں کے جسموں کو شفا کیوں دوں؟ میں اس گاؤں میں کوئی ہاسپٹل کھولوں گی نہ ڈسپنسری۔ میں اگر اپنے لیے کچھ

نہیں کرسکی تو کسی کے لیے بھی کچھ نہیں کروں گی۔ یاد ہے نا بابا نے مجھے اسی لیے ڈاکٹر بننے بھیجا تھا۔ بڑے لمبے چوڑے خواب دیکھے تھے۔ درمکنون لوگوں کی آنکھوں کے کانٹے اور سوئیاں نکال کر اپنی آنکھوں میں گاڑلے۔ نام ہو' شہرہ ہو' ہر طرف سیدہ درمکنون علی عباس رضوی کی پاکیزگی' تقویٰ' خدمت' بے غرضی کا' نام ہو۔ سید علی عباس رضوی کے خاندان کا۔ لوگ کہیں یہ ہوتی ہیں سیدزادیاں یہ ہوتی ہے آل رسولؐ جو اپنی زندگی خدمت خلق کے لیے تیاگ دیتی ہیں یہ ہوتا ہے ایثار۔ اس طرح مارتے ہیں نفس کو۔

مگر مریم! اگر میرے خواب اجڑے ہیں اگر مجھے خواہشوں کو نوچ کر پھینکنا پڑا ہے تو میں بھی بابا کے سارے خواب اسی طرح اجاڑوں گی۔ اب مقابلہ تقویٰ کا ہوگا۔ صرف تقویٰ کا۔ خدمت خلق کا نہیں۔ عاشر کا رشتہ ٹھکراتے ہوئے بابا نے مجھ سے کہا تھا۔

''ہم اہل سادات ہیں' آل رسولؐ ہیں۔ شجرہ نسب سات پشتوں تک دیکھتے ہیں۔ چاول کی کنی جتنا بھی کہیں شبہ ہو جائے تو رشتہ نہیں کرتے۔ تم اس شخص کو اپنے گھر کا رستہ دکھا آئی ہو جس کے خاندان کی سو پشتوں میں بھی کہیں سیدوں کا نام و نشان نہیں۔ تمہارے لیے خاندان میں کوئی رشتہ مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ شادی نہیں کروں گا میں تمہاری۔ تم کو میرے بعد میری گدی سنبھالنی ہے۔ اس علاقے میں خاندان کے نام کو قائم رکھنا ہے۔ تمہیں تعلیم اسی لیے دلوائی ہے تاکہ تم اپنے علم سے لوگوں کی خدمت کرو۔ اس لیے نہیں کہ تم اس طرح کے گھٹیا رشتے اپنے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاؤ۔ درمکنون! تم عام لڑکی نہیں ہو۔ سیدزادی ہو۔ آل رسولؐ ہو۔ تم آسمان سے اتر کر پاتال میں کیوں جانا چاہتی ہو؟ تم دونوں بہنوں کو میں نے لڑکی نہیں لڑکا سمجھ کر پالا ہے۔ تم دونوں نے اس خاندان کے وقار میں اضافہ کرنا ہے۔ نام کرنا ہے۔ عزت بڑھانی ہے۔ ایسی آلائشوں کو آئندہ اس گھر کی دلہیز مت دکھانا۔''

ہاں مجھے یاد ہے۔ ان کی کہی گئی ہر بات حرف بہ حرف یاد ہے۔ ایک ایک کرکے انہوں نے ساری میخیں بڑی مہارت اور صفائی سے میرے وجود اور دل میں گاڑی تھیں مریم! بعض دفعہ یہ خاص ہونا کتنا عذاب ہوتا ہے۔ گلے میں طوق کی طرح پڑ جاتا ہے۔ پھر اترتا ہی نہیں۔ عورتیں میرے ہاتھ چومتی ہیں۔ اپنے بچوں کو میرے ہاتھوں سے شیرنی

کھلاتی ہیں۔ میرے پیروں میں بیٹھنا اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہیں۔ اور میرا دل چاہتا ہے۔ میں ان کے ہاتھ چوموں۔ میں ان سے کہوں میرے سر پر ہاتھ پھیرو۔ میرے لیے دعا کرو۔ ان کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ شوہر' بچے' گھر' آزادی۔ میرے پاس کیا ہے۔ صرف نام۔ ایک لمبا چوڑا نام۔ جو لوگوں کی گردنیں جھکا دیتا ہے پھر وہ مجھے اپنے جیسا انسان سمجھتے ہی نہیں۔ میرا دل چاہتا ہے مریم! میں ان کے سامنے روؤں۔ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ جاہل اور کمی کمینوں کی طرح زمین پر بیٹھ کر بلند آواز میں اپنے سارے دکھڑے روتے ہوئے سناؤں۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر بولوں۔ گندے چیتھڑے پہنے ہوئے جو دل میں آئے۔ میں کہتی جاؤں۔ کسی دوسرے کو بولنے ہی نہ دوں۔ صرف اپنی کہوں صرف اپنی کہوں۔ مگر مریم! مجھے ایک مجسمے کی طرح اونچے پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے خاموش بیٹھنا ہوتا ہے۔ صرف سننا ہوتا ہے۔ دوسروں کی تکلیفیں' پریشانیاں' بیماریاں اور پھر اتنی دھیمی آواز میں بولنا ہوتا ہے جو خود میرے کانوں تک بھی نہ پہنچے۔ بس ان تک پہنچے جنہوں نے سوال کیا ہے۔ جنہوں نے پوچھا ہے۔ مجھے صرف تسلی اور دلاسا دینا ہوتا ہے۔ صبر کی تلقین کرنی ہے' اچھے وقت کی امید دلانی ہوتی ہے اور پھر دعا کی یقین دہانی کروانی ہوتی ہے۔ مریم! یہ سب کتنا مشکل ہوتا ہے یہ تم نہیں جانتیں۔ صرف میں جانتی ہوں۔ صرف میں' وجود کے اندر اٹھتے طوفانوں کے ساتھ خود کو برف کی سل بنا کر پیش کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ سب کو پتا نہیں۔

آج ایک عورت اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر میرے پاس آئی تھی۔ دعا کروانے۔

''اس بے ہدایتی کے لیے دعا کریں بی بی! یہ گمراہ ہو گئی ہے۔ ہماری مرضی سے شادی نہیں کرتی۔ اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ ہم نے بچپن سے اس کا رشتہ طے کر رکھا ہے۔ ہم تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس گمراہ کو سمجھائیں بی بی! اس کو عقل دیں' بتائیں اسے۔ ماں باپ کا کتنا درجہ ہوتا ہے۔ وہ منہ پھیر لیں تو رب بھی ناراض ہو جاتا ہے اور سکھ بھی نہیں ملتا۔''

اس لڑکی کی ماں نے آتے ہی اپنی داستان شروع کر دی تھی۔ میں چپ بیٹھی اس سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی کا چہرہ دیکھتی رہی۔ جو اپنی میلی چادر کے پلو سے بار بار آنکھوں کو پونچھ رہی تھی۔ کچھ دیر میں اسے دیکھتی رہی اور پھر میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔

میں نے اس لڑکی کو بری طرح لعنت ملامت کی تھی (اگر حاکم کا دل اجڑا ہوا ہے تو رعایا کو کیا حق ہے دل بسانے کا) وہ لڑکی چپ چاپ آنسو بہاتے ہوئے سر جھکائے سب کچھ سنتی رہی تھی۔

جب عاشر نے اپنا رشتہ بھیجا تھا تو میں نے بھی اسی طرح بابا کی باتیں سنی تھیں۔ تب مجھ پر بھی کسی کو ترس نہیں آیا تھا۔ پھر وہ عورت مجھے دعائیں دیتی ہوئی اپنی بیٹی کو لے گئی اور مریم! مجھے...... مجھے اسی طرح لوگوں کے دل اجاڑ کر دعائیں لینی ہیں۔ نام رکھنا ہے۔ رتبہ بڑھانا ہے۔ عزت قائم رکھنی ہے۔ آخر سیدہ درمکنون علی عباس رضوی کوئی معمولی لڑکی تو نہیں ہے۔ (اب تو یہ جملہ بھی مجھے ایک زہریلا سانپ لگتا ہے)

تمہارا خط مجھے ابھی نہیں ملا۔ ہوسکتا ہے لاہور پہنچ چکا ہو۔ میری عدم موجودگی میں۔ میں پچھلے خط کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی تمہیں خط لکھ رہی ہوں نہ لکھتی تو آج شاید میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا۔ مجھے اپنے اردگرد پھرنے والے لوگ کچھ اتنے ہی برے لگ رہے ہیں۔

تم خوش تو ہونا مریم؟ میری دعا ہے۔ تم بہت بہت خوش رہو۔

خدا حافظ

تمہاری

درمکنون

22 اپریل

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

میں جانتی تھی مریم! وہ تمہاری کوئی بات' کوئی نصیحت نہیں سنے گا پھر بھی پتا نہیں کیوں میں نے تمہیں اس سے ملنے کے لیے کہا۔ اسے سمجھانے کے لیے کہا۔ تمہارے خط میں لکھی ہوئی باتوں سے مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ پتا نہیں اس شخص کو یوں بے مراد رہنے کا کیا شوق ہے؟ اسے تو کوئی مجبوری نہیں پھر وہ اپنی زندگی' اپنا مستقبل کیوں تباہ کرنا چاہتا ہے؟ یاد ہے نا اس نے اپنا رشتہ ٹھکرائے جانے پر مجھ سے کہا تھا۔

''درمکنون! جب تک تم اس زمین کے اوپر ہو۔ تب تک میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارے خاندان جتنی دولت نہ سہی لیکن بہرحال میرے پاس بھی دولت ہے۔ تمہارے جیسا نام ونسب نہ سہی لیکن کسی عام خاندان سے میں بھی تعلق نہیں رکھتا۔ خوبصورت ہوں' تعلیم یافتہ ہوں اور تم...... تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو پھر میں کیا صرف اس وجہ سے ٹھکرا دیا جاؤں گا کہ سید نہیں ہوں۔ اہل سادات میں سے ہونا میرے بس میں تو نہیں پھر مجھے کس چیز کی سزا ملی؟ درمکنون! میں تمہیں مظلوموں کی فہرست میں شامل نہیں ہونے دوں گا۔

تمہارے باپ نے کہا ہے۔ ہم بیٹیوں کو خاندان سے باہر بیاہنے کے بجائے کنوارا بٹھائے رکھنا بہتر سمجھتے ہیں مگر میں تمہیں ایسی کسی صلیب پر چڑھنے نہیں دوں گا۔ میں نے پچھلے تین سال سے تمہارے اور اپنے حوالے سے بے شمار خواب دیکھے ہیں اور مجھے اپنی آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں سجانے کا کوئی شوق نہیں ہے نہ ہی میں تمہیں کسی مزار کی نام نہاد متولی بننے دوں گا۔ یہ تمہاری اپنی زندگی ہے درمکنون! تمہیں اسے اپنے طریقے سے گزارنے کا مکمل حق اور اختیار ہے۔ اپنے گلے میں رسوم وعقائد کا پھندا ڈال کر خودکشی مت کرو۔''

مریم اس نے ایک بار بھی مجھے ملامت نہیں کی تھی۔ ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ جب تم جانتی تھیں کہ تمہارا باپ تمہیں صرف اپنے ہی خاندان کے کسی سید سے بیاہے گا تو پھر تم نے تین سال تک مجھے فریب کیوں دیئے رکھا۔

جب تمہیں معلوم تھا کہ تم نے اپنے باپ کی گدی سنبھالنی ہے تو پھر تم میرے ساتھ مستقبل کی پلاننگ کیوں کرتی رہیں۔

جب تمہیں پتا تھا کہ تمہارا باپ میرا رشتہ بری طرح ٹھکرائے گا تو تم نے مجھے رشتہ بھیجنے سے کیوں نہیں روکا؟

مریم! اس نے ایک بار بھی مجھ سے یہ سب نہیں کہا۔ میں منتظر تھی کہ وہ کچھ کہے۔ کوئی شکوہ کرے۔ اس طرح کی کوئی بات تو کرے۔ مگر اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا۔

مریم! محبت واقعی دل کو بہت بڑا کر دیتی ہے۔ تب اس کے لفظ میرے وجود پر موم کے قطروں کی طرح گر رہے تھے۔ کچھ جلن' کچھ اضطراب کچھ بے چینی ہوتی اور پھر

سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ ہاں مگر اس کے لفظ موم کے ٹھنڈے قطروں کی طرح آج بھی میرے دل سے چپٹے ہوئے ہیں۔

میں جانتی ہوں میں نے اس سے دھوکا کیا۔ اسے فریب دیا مگر فریب تو میں نے اپنے آپ کو بھی دیا تھا۔ دھوکا تو اپنے وجود سے بھی کیا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ہمارے خاندان میں شادیاں باہر نہیں ہوتیں۔ (کسی غیر سید کی تو بات ہی کیا) میں اپنے آپ کو اس خوش فہمی سے بہلاتی رہی کہ میں بابا سے اپنی باقی ساری باتوں کی طرح یہ بات بھی منوالوں گی آخر اس میں مشکل ہی کیا ہے مگر مریم! رسوم و رواج کے سامنے رشتے اور محبت کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہم نے اپنے وجود کو اتنی اونچی اونچی فصیلوں میں قید کر لیا ہے کہ اب چاہیں بھی تو روشنی ہم تک پہنچ نہیں پاتی۔

مریم! کاش میں عاشر عثمان سے کبھی نہ ملی ہوتی کاش میں نے اسے کبھی نہ دیکھا ہوتا۔

وہ میڈیکل کالج میں مجھ سے تین سال سینئر تھا پھر بھی پتا نہیں کیوں پورے کالج میں مجھے وہی ایک ایسا چہرہ نظر آیا تھا۔ جس سے مجھے خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ ہمارے پروفیسر ڈاکٹر عثمان مکرم کا بیٹا تھا۔

تمہیں یاد ہے۔ اس سے میری پہلی ملاقات تمہارے ساتھ ہی سر عثمان مکرم کے گھر ہوئی تھی پھر آہستہ آہستہ اس سے جان پہچان بڑھتی گئی تھی۔ کالج میں اکثر وہ تم سے ملتا کیونکہ تمہارے ابو ڈاکٹر عثمان کے بہت اچھے دوست تھے۔ میں تمہارے ساتھ ہوتی' اس لیے مجھ سے بھی اس کی بات چیت ہوتی رہتی۔ تب ہی مجھے یوں لگنے لگا جیسے کچھ غلط ہو رہا ہے۔ مجھے لاشعوری طور پر اس کے انتظار کی عادت پڑنے لگی تھی۔ میری نظریں کالج میں ہر وقت اسی ایک چہرے کو ڈھونڈتی رہتی تھیں۔ اور جس دن مجھے اس بات کا احساس ہوا تو میں بہت دیر تک دم بخود رہی تھی پھر میں نے اس سے نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں کالج میں اسے نظر انداز کرنے لگی۔ وہ اگر کہیں نظر آتا تو میں بہت خاموشی سے وہاں سے ادھر ادھر ہو جاتی اگر کبھی تمہارے پاس آتے ہوئے نظر آتا تو میں کوئی بہانا کر کے تمہارے پاس سے چلی جاتی۔

تم تقریباً ہر ہفتے مجھے لے کر پروفیسر عثمان کے گھر جاتی تھیں۔ میں نے وہاں

جانا بھی چھوڑ دیا۔ میں خود کو یہ یقین دلانے میں مصروف تھی کہ مجھے اس سے محبت نام کی کوئی شے نہیں ہے۔

اسی طرح پورا ایک ماہ گزر گیا۔ پھر اس دن میں کسی کام سے پروفیسر عثمان مکرم کے آفس میں گئی تھی۔ وہ آفس میں نہیں تھے مگر عاشر تھا۔ میں کنفیوز ہو گئی اور اس سے پہلے کہ میں خاموشی سے باہر آ جاتی' اس نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔

''درمکنون! کیا آپ کو میری کوئی بات بُری لگی ہے؟۔'' اس نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔

''نہیں۔ آپ نے یہ کیوں پوچھا ہے؟۔'' میں نے کچھ نروس ہو کر عاشر سے کہا تھا۔

''آپ پورے ایک ماہ سے مجھے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مریم کے ساتھ ہمارے گھر نہیں آتیں۔ اگر کبھی میں مریم کے پاس آؤں تو آپ وہاں سے چلی جاتی ہیں اگر میں کہیں اور نظر آ جاؤں تو آپ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتی ہیں۔''

''نیتوں کا حال تو صرف خدا جانتا ہے پھر وہ شخص ......'' میں گونگوں کی طرح کھڑی بس سوچ کر رہ گئی۔

''نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس میں آج کل بہت مصروف ہوں۔'' میں نے اپنی زرد پڑتی رنگت بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ اسٹڈیز کی وجہ سے مصروف ہیں؟۔'' اس نے بڑے آرام سے میری بات مان لی۔

''ہاں۔'' میں نے سکون کا سانس لیا۔

''واقعی آپ کے پیپرز بھی تو جلد ہی ہونے والے ہیں۔ دو ماہ ہی تو رہ گئے ہیں۔ آپ کو بہت محنت کرنی پڑ رہی ہوگی۔'' ایک کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے اس نے مجھے دیکھے بغیر بڑی نرمی سے کہا۔ میرا دل چاہا۔ میں شرم سے ڈوب مروں۔ وہ یہ جاننے کے باوجود کہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میرا جھوٹ نبھانے میں میری مدد کر رہا تھا۔

دو ماہ تک اس سے دوبارہ میری ملاقات نہیں ہوئی اور جس دن میں اپنا آخری پیپر دے کر ہاسٹل آئی تو اس نے مجھے وہاں رنگ کیا تھا۔

"درکنون! اگلے ہفتے میری بہن کی شادی ہے۔ مریم کو تو میرے پاپا انوائیٹ کریں گے ہی لیکن آپ کو میں انوائیٹ کر رہا ہوں۔"

فون پر اس کی آواز نے مجھے جتنا حیران کیا تھا۔ اس کے اس مطالبے نے اس سے زیادہ حیران کیا تھا پھر میں چاہتے ہوئے بھی انکار نہیں کر سکی۔ میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ میں عاشر کی دعوت پر وہاں جا رہی ہوں۔ تمہارے سامنے میں نے یہ ہی ظاہر کیا تھا کہ میں تمہارے کہنے پر وہاں جا رہی ہوں۔

اس نے اپنی بہن کی شادی کی تقریبات میں ہی مجھے پرپوز کیا اور میں انکار نہیں کر سکی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس رشتے کو کوئی قبول نہیں کرے گا۔ میں نے پھر بھی خود کو فریب دیئے رکھا اور اب ...... اب میں خالی دل اور خالی ہاتھوں سے دعا گو ہوں کہ وہ مجھے بھول جائے۔ اسے زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے پھر مجھ جیسی لڑکی کے ساتھ اس نے عشق کا روگ کیسے پال لیا؟

کاش مریم! کاش مجھے کوئی جادو آتا ہوتا اور میں وہ جادو' وہ منتر اس پر پڑھ کر پھونک دیتی پھر اسے کبھی درکنون نام کی کسی لڑکی کا خیال آتا نہ اس کی شبیہہ اس کے ذہن میں یوں نقش ہوتی۔

ہاسپٹل میں سارا دن میں ڈاکٹر عثمان مکرم سے چھپی پھرتی ہوں۔ عاشر کی طرح انہوں نے بھی کبھی کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی میری مجبوری جانتے ہیں۔ پھر بھی مجھے ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں وہ مجھ سے کچھ پوچھ نہ بیٹھیں۔ کہیں وہ اپنی ناراضگی کا اظہار نہ کریں۔

انہوں نے عاشر کا پرپوزل میرے لیے میرے گھر لے جانے سے پہلے تمہارے ذریعے دو بار مجھ سے پوچھا تھا۔ کہیں ہمارے خاندان میں صرف سیدوں میں تو رشتہ نہیں کیا جاتا اور میں مریم! سب کچھ جانتے ہوئے بھی انہیں صاف صاف سب کچھ نہیں بتا سکی تھی۔

میرے دل میں بس کہیں ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید...... شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔

شاید بابا کو مجھ پر ترس آ جائے۔
شاید میری قسمت یاوری کر جائے۔

مگر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ دوٹوک انکار ڈاکٹر عثمان مکرم کے منہ پر مار دیا گیا تھا۔ اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ خاموشی سے پلٹ آئے تھے۔ میں نے بابا کو بہت سی دلیلیں دینے کی کوشش کی تھی۔ اور ہر دلیل میرے خلاف محاذ کو اور مضبوط کرتی گئی تھی۔ میرے سامنے کتابوں کا ڈھیر رکھ دیا گیا تھا۔ بابا کو لگا تھا' میں اپنا شجرہ نسب بھول گئی ہوں۔ میں اپنے عقیدے سے پھر گئی ہوں۔ میں نے ان کے اعتبار' ان کے اعتماد کو خاک میں ملا دیا تھا۔ میں نے ایسا کہاں کیا تھا۔ میں ایسا کیسے کر سکتی تھی۔ میں نے تو صرف وہ بنیادی حق استعمال کرنے کی کوشش کی تھی جو میرے دین نے مجھے دیا تھا۔ جو میرے پیغمبرؐ نے مجھے بخشا تھا اور اسی پیغمبرؐ کی آل نے اس حق کو مجھ سے چھین لیا تھا۔

مجھ پر دو پہرے دار لگا کر بابا سمجھتے ہیں مجھے "غلط کام" سے روک لیں گے۔ مگر میں تو کوئی غلط کام کرنا ہی نہیں چاہتی۔ اور اگر کرنا چاہوں تو کیا یہ دو نگران روک سکتے ہیں۔ نہیں روک سکتے مگر یہ بات بابا کی سمجھ میں نہیں آتی۔ انہیں تو کبھی بھی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا پھر بھی وہ ایک لبرل آدمی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کیا بیٹی کو صرف تعلیم دلوا دینا لبرل ازم ہے۔ اور حقوق؟ ان کا کیا ہوگا؟ کیا حقوق دینا ناجائز ہے؟ میں حقوق پر کتنی ہی بحث کیوں نہ کر لوں۔ کتنی ہی جنگ کیوں نہ لڑوں' کچھ حقوق اہل سادات بیٹیوں کو دیتے ہی نہیں۔ کچھ چیزوں سے ہمیں محروم رہنا ہی پڑتا ہے۔ میں تمہیں کیا لکھتی ہوں۔ میں نہیں جانتی۔ بس میں لکھ دیتی ہوں۔ وہ سب جو میرے دل میں ہوتا ہے جو مجھے چبھتا ہے۔ جو اندر سے کاٹتا ہے۔ تمہیں بھی نہ لکھوں تو مر جاؤں اور ہے ہی کون جو میری باتیں سنے۔

درکنون

23 مئی

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

پچھلے دنوں سے میری عجیب حالت ہوگئی ہے۔ ہر وقت ایک عجیب سی بے چینی میرے وجود کو گھیرے رہتی ہے۔ کسی چیز میں میرا دل نہیں لگ رہا۔ اب تو ٹریکولائزرز کا

بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ میرا دل چاہتا ہے۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور بھاگ جاؤں کسی جنگل' کسی ویرانے میں جہاں کوئی نہ ہو' کوئی بھی نہ ہو۔

مریم! مجھے فون کرو' مجھ سے بات کرو۔ میں تمہاری آواز سننا چاہتی ہوں۔ میں اپنے لیے کسی ایک آواز میں محبت اور نرمی محسوس کرنا چاہتی ہوں۔

خدا حافظ

درمکنون

24 جون

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

اگر مجھے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ تم رو رو کر میرے لیے پاگل ہو رہی ہو گی اور اس حالت میں اس طرح رونا اور پریشان ہونا تمہارے لیے کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے تو میں اب تمہیں کبھی خط نہ لکھتی۔ میں جانتی ہوں۔ پچھلے چند ہفتوں میں تم نے کئی بار مجھے فون کیا ہے' مگر پھر بھی تمہاری مجھ سے گفتگو نہیں کروائی گئی۔ بہت اچھا ہوتا مریم! اگر تمہیں یہ پتا نہ چلتا کہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ اور میں ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوں۔ جس مشکل سے میں یہ کاغذ اور قلم ڈاکٹر سے حاصل کر سکی ہوں۔ وہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ اور اب میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔

مریم! میں ٹھیک ہوں۔ زندہ ہوں۔ تم پریشان مت ہونا۔ میرے لیے دعا کرنا۔

خدا حافظ

درمکنون

25 جولائی

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

پچھلے دو ماہ مجھ پر بہت بھاری گزرے ہیں۔ اب جب ایک بار پھر ہاسٹل کے

اس کمرے میں واپس آئی ہوں تو مجھے تم یاد آ رہی ہو۔ مریم! میرے وجود کے اندر اس قدر خاموشی ہے کہ مجھے یوں لگنے لگا ہے۔ جیسے میرے اندر کہر جم گیا ہو۔ وہی ہڈیوں تک اتر جانے والا۔ دسمبر کا سرد اور سفاک کہر اور حیرت کی بات یہ ہے کہ آج کل جولائی ہے اور پھر بھی ...... آج آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر مجھے بے تحاشا ہنسی آئی۔ آئینے میں نظر آنے والا چہرہ درمکنون کا چہرہ تھا اور درمکنون ہی اسے پہچان نہیں پا رہی تھی۔

ہاسپٹل میں گزارے ہوئے دو ماہ نے مجھے بے حد بدصورت کر دیا ہے۔ اب تو شاید تم بھی مجھے پہلی نظر میں پہچان نہیں سکو گی۔ مگر مریم! میرا چہرہ بدلے یا وجود' قسمت کبھی نہیں بدلے گی۔ اس کو میرے ساتھ ساتھ ہی رہنا ہے۔ پچھلے دو ماہ سے اپنے اردگرد وہی چہرے دیکھ دیکھ کر بے زار ہو گئی ہوں۔ تم سوچو گی میں کیسی بیٹی ہوں جو اپنے ماں باپ کے چہرے دیکھ کر بے زار ہو جاتی ہے۔ مگر مریم! میں کیا کروں۔ مجھے ان دونوں کے چہرے پر کوئی شفقت' کوئی مانوسیت نظر نہیں آتی۔ مجھے دوسرے لوگوں اور ان کے چہروں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

ان دونوں نے مجھ سے اتنی بڑی قربانی لی ہے کہ میری ذات پر کیے جانے والے ان کے سارے احسان اس ایک قربانی کے مقابلے میں بہت چھوٹے ہو گئے ہیں۔

جب میں نے قیمت چکا دی تو پھر رشتے کس حد تک رہ گئے؟ ان کے مہنگے ڈاکٹرز' قیمتی میڈیسنز اور عمدہ خوراک میرے دل کے بیچوں بیچ لگائے گئے گھاؤ نہیں بھر سکتے۔ وہ مجھے خوش رکھنے کے لیے سب کچھ کر رہے ہیں تاکہ میں مکمل صحت یاب ہو جاؤں۔ ہاں بس عاشر عثمان مجھے نہیں دے سکتے۔ اور مجھے مریم! مجھے بس اسی ایک چیز کی ضرورت ہے۔ تم نے فون پر بار بار مجھ سے کہا تھا۔

"درمکنون! تمہیں نروس بریک ڈاؤن کیسے ہو گیا۔ تم اتنی کمزور تو نہیں تھیں۔"

ہاں مریم! میں پہلے کمزور نہیں تھی۔ اب ہو گئی ہوں۔ اپنے وجود اور ذات کی کرچیاں سنبھالنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ تم نہیں جانتیں اور میں...... آج کل یہی کام کر رہی ہوں۔ میری بیماری نے مجھے دو ماہ تک ان دونوں باڈی گارڈز کے بھیانک چہروں سے دور رکھا۔ اب ہاسٹل میں آنے کے بعد ایک بار پھر وہی چہرے میرے وجود کو اپنی نظروں سے

چھلنی کرنے کے لیے میرے سامنے ہوں گے۔ میں جانتی ہوں۔ میں عاشر عثمان والی غلطی نہ کرتی تو بابا ان دونوں کو عذاب کی شکل میں میرے سر پر مسلط نہ کرتے۔

مگر اب تو عاشر عثمان میری زندگی میں نہیں ہے اب تو وہ اس شہر' اس ملک میں بھی نہیں ہے۔ پھر بھی بابا کو اتنی بے اعتباری کیوں ہے؟ مریم! مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ میں ان سے یہ کہہ سکوں کہ وہ مجھ پر اعتبار کریں۔ مجھ پر اس طرح پہرے مت بٹھائیں۔

میرا دل چاہتا ہے۔ میں شادی کر لوں۔ کسی بھی شخص سے مگر بس وہ سید نہ ہو۔ اس کے ساتھ میں عام زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ تمہارے جیسی زندگی سب لڑکیوں جیسی زندگی۔ مریم! میں کسی گدی کی جانشین بننا چاہتی ہوں نہ کسی مزار کی متولی۔ مجھ میں اتنی پاکیزگی ہے نہ روحانیت۔ میں نفس کو نہیں مار سکتی ہوں۔ میں لوگوں کو ان چیزوں کی دعائیں نہیں دے سکتی جو میرے پاس نہیں ہیں۔ عورتیں میرے ہاتھ چومیں' میری چادر کو آنکھوں سے لگائیں' میرے سامنے الٹے پیروں واپس جائیں۔ یہ سب میری خواہش نہیں ہے۔ مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔

مجھے گھر چاہیے۔ میں اپنی زندگی اجاڑ کر لوگوں کی زندگی نہیں سنوار سکتی اور یہ سب مریم! یہ سب میں بابا سے نہیں کہہ سکتی۔ وہ یہ سب سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وہ تو کچھ بھی سمجھ نہیں سکتے۔ میری ذات کا کوئی فیض میرے وجود کو نہ پہنچے اور میں ساری عمر لوگوں کو تعویذ دیتی رہوں۔ پھونکیں مارتی رہوں۔ کیوں مریم میں کیوں یہ سب کروں۔ کیا اللہ نے مجھے ہی زندگی اس لیے دی تھی کہ میں اس کو قربانی بنا کر رکھ دوں۔

بعض دفعہ میرا جی چاہتا ہے میں کہیں بھاگ جاؤں۔ بہت دور کہیں اتنی دور کہ کوئی میرے نام کے ساتھ کوئی القاب نہ لگائے۔ میں جو چاہے کروں۔ جیسے چاہوں رہوں۔ کوئی یہ نہ کہے کہ درمکنون سیدزادی ہو کر یہ کر رہی ہے۔ مگر میں کہیں نہیں جا سکتی۔ میرے قدموں کی زنجیر بھی لفظ ہیں۔ نام ہے۔ خاندان ہے۔ مجھے ہر وقت اپنے وجود پر کیڑے رینگتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں زندہ نہیں ہوں۔ جیسے میں کوئی اور ہوں۔ درمکنون کوئی اور ہے۔

آج کل میری دماغی حالت کچھ ایسی ہے۔ اور میں زمین پر ایک بار پھر پیر جمانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

مریم! میرے لیے دعا کرو۔

خدا حافظ

درمکنون

26 اگست

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

مریم! میرے لیے عذاب ایک ایک کر کے بڑھتے ہی جا رہے ہیں اور ان کے کم ہونے کا کہیں کوئی امکان نہیں ہے۔ چند دن پہلے بابا میرے لیے ایک پرپوزل لے کر آئے تھے۔ اور بھلا کس کا؟ میرے خالہ زاد اور مجھ سے چار سال چھوٹے سبط علی کا۔ اور جانتی ہو' ستم ظریفی کیا ہے' درنجف اور سبط علی دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور یہ بات اگر مجھے معلوم ہے تو کیا بابا کو پتا نہیں ہوگی۔ امی نہیں جانتی ہوں گی۔

سبط علی نے بہت احتجاج کیا تھا۔ مگر پھر بھی اسے خاندان کی عزت کا واسطہ دے کر سب نے اپنی بات ماننے پر مجبور کیا ہے اور کسی نے درنجف کا نہیں سوچا۔ اس کا دل کتنا بانجھ ہو جائے گا۔ یہ خیال کسی کو کیوں نہیں آیا اور مریم! مجھے بتاؤ میں کیسے اپنی بہن کے گلے میں پڑا ہوا ہار کھینچ کر اپنے گلے میں ڈال لوں۔ کیسے اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی روشنی کو بجھا کر اپنی آنکھوں کے دیے روشن کرنے کی کوشش کروں۔ میرے لیے کوئی ایثار کیوں کرے۔ کوئی قربانی کیوں کرے۔

میرے نروس بریک ڈاؤن نے بابا کو میرے بارے میں پریشان کر دیا ہے۔

اب وہ دوسروں کی چھتیں گرا کر میرے لیے محل تیار کرنا چاہتے ہیں۔

میں ان کی جانشین ہوں۔ ان کی گدی کی وارث جو ہوئی۔ پہلے میرا دل اجاڑ کر اب گھر آباد کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی دوسری بیٹی کا دل اجاڑ کر۔

مریم! ماں باپ اتنے خود غرض کیوں ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی عزت اور رواجوں کے سامنے اولاد کی آنکھوں کے پاتال نظر ہی نہیں آتے۔

''ہم نے تمہیں یہ دیا۔ ہم نے تمہیں وہ دیا۔''

اور پھر وہ ان سب نوازشات اور عنایات کی قیمت مانگتے ہیں اور قیمت اگر زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہو تو دل کس طرح خون ہوتا ہے۔ یہ تم نہیں جان سکتیں مریم! یہ صرف میں جان سکتی ہوں یا پھر درنجف۔ ایک معمولی سا عقیدہ' ایک معمولی سی انا اتنی بڑی چیزیں بن گئی ہیں کہ ان کے ہاتھوں بہت سی سیدہ درمکنون اور درنجف خوار ہو جاتی ہیں۔ کیا عاشر عثمان سے میری شادی سارے مسائل کا حل نہیں ہے؟ بتاؤ مریم! کیا ایک چھوٹی سی قربانی سب کچھ ٹھیک نہیں کر سکتی۔ بابا مجھے بے شک جائیداد سے عاق کر دیں۔ بے شک اپنا جانشین نہ بنائیں۔ بس اپنی مرضی سے میری شادی عاشر عثمان سے کر دیں۔ مجھے اپنی مرضی سے اپنے گھر سے رخصت کر دیں۔ پھر چاہیں ساری عمر اپنے پاس نہ آنے دیں اور بابا کو یہی کام سب سے مشکل لگتا ہے۔ یہی کام پہاڑ لگتا ہے۔ مجھے خوشی دینا چاہتے ہیں مجھے گھر دینا چاہتے ہیں۔ عاشر عثمان کے بغیر کیا میرے لیے خوش رہنا اور کسی دوسرے شخص کا گھر آباد کرنا ممکن ہے۔ وہ بھی اس شخص کا گھر جسے میری بہن چاہتی ہے۔ جو درنجف کا عاشر عثمان ہے۔

مریم! سیدوں کے گھر بیٹیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ صرف بیٹے ہی ہونے چاہئیں۔ یہ لوگ بیٹیوں سے محبت کے دعوے کرتے ہیں انہیں سیپ میں بند موتی کی طرح رکھتے ہیں اور ساری عمر سیپ میں ہی بند رکھنا چاہتے ہیں۔ مریم! تم نے کبھی موتی کو گھن لگتے دیکھا ہے؟ میں نے دیکھا ہے ہاں مریم سیپ میں بند موتی کو بھی گھن لگ جاتا ہے۔ پھر وہ اندر ہی اندر برادہ بن جاتا ہے۔ کوئی شور کوئی آواز کیے بغیر۔

سیدہ درمکنون کو بھی سب نے مل کر سیپ کا موتی بنا دیا ہے۔ سیپ میں بند کر دیا ہے۔ اب گھن لگانا چاہتے ہیں۔ برادہ بنانا چاہتے ہیں اور سیدہ درمکنون انہیں روک نہیں سکتی۔ ہاتھ نہیں پکڑ سکتی۔ چیخ نہیں سکتی۔ بُرا بھلا نہیں کہہ سکتی۔ سر نہیں اٹھا سکتی۔

یہ سب کام اہل سادات کی بیٹیاں نہیں کر سکتیں۔ مجھے بتاؤ مریم! میں کیا کروں۔

میں کہاں جاؤں۔

لوگ کہتے ہیں سیدوں کی دعائیں ہمیشہ قبول کی جاتی ہیں۔ سیدوں پر آفتیں نہیں آتیں۔ مریم! اہل سادات پر اور آتا ہی کیا ہے۔ صبر کریں تو دل مر جاتا ہے۔ صبر نہ کریں تو ساری عمر ضمیر سنگسار کرتا ہے۔ ماں باپ کی بددعائیں دوزخ بن کر پیچھے بھاگتی رہتی ہیں۔ زمین پر دونوں پاؤں سے کھڑا رہنا ایک پاؤں کھڑے رہنے سے زیادہ مشکل ہے۔ ایک پاؤں پر کھڑا رہنے پر آپ تھک کر تو گر سکتے ہیں۔ دونوں پاؤں پر کھڑے رہنے سے یہ بھی نہیں ہو سکتا۔

میری دعا کسی کو نہیں لگتی۔ میں تمہارے لیے دعا نہیں کروں گی۔ تم میرے لیے دعا کرنا۔

خدا حافظ

درمکنون

27 ستمبر

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

میری سالگرہ کا دن یاد رکھنے کے لیے تمہارا شکریہ۔ جانتی ہوں تم اس جملے پر ناراض ہو جاؤ گی پھر بھی۔ تمہارا کارڈ اور گفٹ ہمیشہ کی طرح پسند آیا۔ اس بار پہلی دفعہ تم نے مجھے اپنے ہاتھ سے یہ دونوں چیزیں نہیں دیں۔ بلکہ پارسل کی تھیں۔ اس سال میری زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں یہ بھی ایک تبدیلی تھی۔ اپنی سالگرہ والے دن تمہارا فون سن کر میں بہت دیر تک روتی رہی۔ بہت سے لوگ مجھ سے جتنے دور ہیں۔ میرے دل کے اتنے ہی پاس ہیں اور میری بدقسمتی یہ ہے کہ مجھے اب ان لوگوں کے بغیر ہی' ان سے دور ہی رہنا ہے۔

مریم! سالگرہ والے دن تم سے پہلے اس نے بھی مجھے فون کیا تھا۔ میں نے اس کی آواز پہچانتے ہی فون بند کر دیا تھا۔ پھر میٹرن کو یہ کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی کہ عاشر

عثمان کی کسی فون کال پر مجھے نہ بلایا جائے اور مریم! وہ رات تک کالز کرتا رہا تھا۔ میں نے اس سے بات کرنے سے اس کی آواز سننے سے خود کو باز رکھا۔ مگر میں اس کا کارڈ اور گفٹ وصول کرنے سے خود کو روک نہیں سکی۔

میں جانتی ہوں۔ مجھے یہ دونوں چیزیں نہیں لینی چاہیے تھیں۔ مگر مریم! میں کیا کروں۔ تم بتاؤ میں کیا کروں۔ مریم! میں اس کا ہر کارڈ' ہر خط لے لیتی ہوں۔ میں بزدل ہوں' میں منافق ہوں۔ میں ماں باپ کی نافرمان اولاد ہوں۔ میں باغی ہوں۔ میں سرکش ہوں۔

میں نے بابا سے وعدہ کیا تھا کہ میں عاشر کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رکھوں گی۔ اور میں...... مریم! میں ان کو صریح دھوکا دے رہی ہوں۔ مگر میں کیا کروں۔ مجھے زندہ رہنا ہے۔ اس کے کارڈز اور خطوں کے بغیر میں مر جاؤں گی۔ میں اس کو ان خطوں کا جواب نہیں دیتی مگر وہ پھر بھی مجھے خط لکھتا رہتا ہے۔ کارڈ بھیجتا رہتا ہے۔ یاددہانی کراتا رہتا ہے کہ وہ مجھ سے' صرف مجھ سے صرف درمکنون سے محبت کرتا ہے۔ صرف مجھے چاہتا ہے۔ صرف میری پروا کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ مریم! وہ مجھے یاد رکھے گا تو اپنی زندگی عذاب بنا لے گا۔ بھول جائے گا تو میری زندگی جہنم بن جائے گی۔ پھر بھی مریم پھر بھی میری خواہش ہے کہ وہ مجھے بھول جائے۔ درمکنون کے بغیر زندگی کو دیکھے۔

یہی بہتر ہے عاشر عثمان کے لیے۔ آہستہ آہستہ ہی سہی مگر اسے میرے بغیر رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تم ایک بار پھر اس سے بات کرو' اسے سمجھاؤ۔ اس سے کہو یہ میں چاہتی ہوں۔ یہ میری خواہش ہے۔

تم نے پوچھا ہے کہ میں تمہارے بیٹے یا بیٹی کے لیے نام تجویز کروں۔ تم میرا دیا ہوا نام اسے دینا چاہتی ہو۔ یہ تمہاری خواہش ہے۔ میں اسے کیسے رد کر دوں۔ اگر تمہارے ہاں بیٹا ہوا تو اس کا نام بلال رکھنا اور اگر بیٹی ہوئی تو معصومہ مگر میری دعا ہے۔ تمہارے ہاں بیٹی نہ ہو۔ ہاں مریم! یہ جاننے کے باوجود کہ تم اپنی بیٹی کو بہت چاہو گی۔ بہت اختیار دو گی پھر بھی میں چاہوں گی کہ تمہارے ہاں بیٹی نہ ہو۔

خدا حافظ

درمکنون

28 اکتوبر

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

اس سال پہلی اور شاید آخری اچھی خبر مجھے تم نے دی ہے فون پر میں نے تمہیں بلال کی پیدائش پر مبارک باد دے دی ہے۔ اب تحریر کے ذریعے ایک بار پھر مبارک دے رہی ہوں۔ میری دعا ہے بلال تمہاری زندگی کو ہمیشہ خوشیوں سے منور کرتا رہے۔ تم نے اس کی پیدائش کے تین دن بعد اس کی جو فوٹو گرافس کھینچ کر مجھے بھیجی ہیں وہ مجھے مل گئی ہیں اور مریم میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔

وہ بالکل تمہارے جیسا ہے اور تمہیں لگتا ہے۔ اس کی شکل میرے جیسی ہے۔ میرا دل اس کی تصویر دیکھ کر چاہتا ہے کہ میں اس کے چہرے کے نقوش کو ہاتھ سے محسوس کروں۔ ماتھا' آنکھیں' ناک' ہونٹ' گال' ٹھوڑی ہر چیز اور اس کھلکھلاہٹ کو سنوں جو تمہارے دل سے بلال کو دیکھ کر ابھرتی ہو گی۔ میرا دل چاہتا ہے مریم! کاش میں اس وقت تمہارے پاس تمہارے ساتھ مل کر بلال کو دیکھتی۔ تمہارے چہرے پر ابھرنے والی شفق دیکھ کر ایک بار پھر ہنسنے کی کوشش کرتی۔ ویسے ہی جس طرح ہم دونوں کبھی مل کر ہنسا کرتے تھے۔ مگر جانتی ہوں۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ میں بلال کے لیے کچھ گفٹس بھیج رہی ہوں۔ تم مجھے اس کی کچھ اور تصویریں بھجواؤ۔

خدا حافظ

درمکنون

29 نومبر

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

مریم! کل مجھے میرے نہ چاہنے کے باوجود سبط علی سے منسوب کر دیا گیا اور کل سے میں اپنے کمرے میں بند ہوں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ میں درنجف کا سامنا کر

سکوں۔ یا خود اپنا چہرہ ہی آئینے میں دیکھ سکوں۔ درنجف پچھلے چار دنوں سے گونگوں کی طرح میرے سامنے پھر رہی ہے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ مجھ سے کہہ سکتی کہ میں سبط علی سے شادی نہ کروں۔ کیونکہ وہ سبط علی سے محبت کرتی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہی ویرانی دیکھی ہے جو کبھی عاشر عثمان کا رشتہ ٹھکرائے جانے پر میری آنکھوں میں در آئی تھی۔ میں نے اس کے وجود کو اسی طرح گم اور کھویا کھویا دیکھا ہے۔ جس طرح پچھلے ڈیڑھ سال سے میں بنی ہوئی ہوں۔ مگر پھر بھی وہ بولتی نہیں۔ کہتی نہیں کہ اس کی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ اسے پتا ہے کہ سبط علی کے بعد خاندان میں اور کوئی دوسرا رشتہ نہیں ہے۔ اگر میری شادی اس سے ہو گئی تو پھر درنجف کو ساری زندگی پھوپھو آمنہ کی طرح اسی حویلی کی چار دیواری میں لمبی لمبی چادروں میں لپٹ کر گزارنی پڑے گی مگر مریم! وہ پھر بھی چپ ہے۔ میرے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی ہے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ عاشر عثمان کا صدمہ بھلانے کا یہی واحد راستہ ہے۔ مگر مریم! سبط علی کبھی بھی عاشر عثمان کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اور دیکھو مریم! میں کس قدر بزدل ہوں۔ میں نے کچھ کہے بغیر سبط علی کے نام کی انگوٹھی اپنے ہاتھ میں پہن لی ہے۔ تقریباً دو ماہ بعد میں سبط علی اور درنجف کے خواب اجاڑ کر اپنا گھر بسانے چلی جاؤں گی۔ اور جب عاشر عثمان کو یہ سب پتا چلے گا تو کیا وہ مجھ پر تھوکے گا نہیں۔

اور کیا میں سبط علی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں؟

اس سوال کا جواب تم جانتی ہو۔ مگر مریم پھر بھی میرے والدین نے اپنی دونوں بیٹیوں کو ایک ہی چھری سے ذبح کرنے کا اہتمام کر لیا ہے۔ میں درنجف کا چہرہ پڑھ سکتی ہوں۔ کیا وہ نہیں پڑھ سکتے؟ بابا دوسروں کی بیٹیوں کے لیے اچھے نصیبوں کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ انہیں اپنی بیٹیوں کا خیال کیوں نہیں آتا؟ بیٹی نہ سمجھتے مریدنی سمجھ کر ہی ہمارے حق میں دعا کرتے۔ پہلے درمکنون اجڑی تھی۔ اب درنجف کی باری ہے۔ پیچھے کون رہ جائے گا۔ کیا رہ جائے گا۔ سات نسلوں سے چلی آنے والی اس رسم کو کسی کو تو بدلنا چاہیے۔ کسی کو تو بنیاد کا پتھر بننا چاہیے۔ مگر میں' ہاں میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں بنیاد کا وہ پہلا پتھر نہیں بن سکتی۔ بنیاد کے اس پہلے پتھر کو بہت نیچے' بہت گہرا دفن ہونا پڑتا ہے۔ بہت وزن سہارنا پڑتا ہے اسے۔ اور میں مریم! میں اندر سے اتنی کھوکھلی' اتنی بھربھری ہو چکی ہوں کہ کبھی

بھی وہ پہلا پتھر نہیں بن سکتی۔ اس شخص سے شادی کرنا کیسا لگتا ہے جس کے دل میں کوئی پہلے سے ہی آباد ہو چکا ہو اور کیسا لگتا ہے مریم! یہ علم کہ وہ دل آباد کرنے والا آپ کو بھی بہت عزیز ہو۔

دو ماہ بعد میری زندگی میں ایک ایسا ہی بنا ہوا شخص آئے گا۔ جس کے دل میں میری ہی طرح کوئی پہلے سے ہی آباد ہو گا۔ اسے درنجف یاد آئے گی۔ مجھے عاشر عثمان۔ میرے وجود میں اسے نجف کی جھلک نظر آئے گی اور اس کے وجود میں...... میں عاشر عثمان کی شبیہہ ڈھونڈوں گی۔ اور یہ تلاش ہمیشہ جاری رہے گی۔ ہم دونوں کو ساری عمر اپنے اپنے آسیبوں کے ساتھ رہنا ہے۔ ہاں مریم! جس سے محبت کی جائے' وہ اگر نہ ملے تو پھر وہ آسیب ہی بن جاتا ہے۔ لرزاتا ہے۔ ہولاتا ہے۔ تڑپاتا ہے۔ رلاتا ہے۔ ہاں مگر مارتا نہیں۔ مریم! بس مرنے نہیں دیتا۔ موت جیسی نعمت حاصل ہونے نہیں دیتا۔ مریم! میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں اپنی ساری ڈگریاں ایک ایک کر کے ایک بہت بڑے الاؤ میں جلاؤں۔ انہیں بہت اونچا اچھالوں اور پھر جب وہ زور سے بھڑکتے ہوئے الاؤ میں گریں اور شعلے یک دم تیز ہو جائیں تو میں زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ ہنسوں' چیخیں مار مار کر ہنسوں۔ میرا کوئی سرٹیفکیٹ' کوئی ڈگری۔ میری ذات کو ریت کا ایک ڈھیر بننے سے نہیں روک سکتا۔ کوئی گولڈ میڈل مجھے عاشر عثمان نہیں دلا سکتا۔ کوئی رول آف آنر سبط علی سے میری شادی نہیں رکوا سکتا۔ اور پھر بھی مریم! پھر بھی میں اس دنیا میں رہنا چاہتی ہوں۔ ہے نا حیرت کی بات کہ مجھے ابھی بھی زندگی سے نفرت نہیں ہوئی۔ ابھی بھی یہاں میرا دم نہیں گھٹتا۔ مگر کب تک مریم! کب تک میں اس طرح سانس لیتی رہوں گی۔ دوسروں کے گلے گھونٹ کر میں کب تک زندہ رہوں گی۔ پہلے عاشر عثمان تھا۔ صرف عاشر عثمان۔ اب درنجف اور سبط علی۔ میری گردن پر کتنوں کا خون آئے گا۔ میری بزدلی کتنوں کی زندگیاں اجاڑے گی۔ کتنوں کی آنکھوں کے خواب چھینے گی۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں۔ اپنی مرضی سے نہیں کر رہی۔ مگر پھر بھی پشیمان ہوں اور وہ جو یہ سب کچھ کر رہے ہیں' بقائمی ہوش و حواس کر رہے ہیں۔ مریم! ان کا دل کیوں نہیں کانپتا؟ انہیں خوف کیوں نہیں آتا۔

مریم! میرے لیے کچھ ایسا کرو کہ مجھے سکون آ جائے۔ یہ کانٹے جو میرے وجود

پر آگ آئے ہیں' یہ ختم ہو جائیں۔

در مکنون

30 دسمبر

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

خدا سے دعا ہے۔ وہ تمہیں ہر تکلیف سے بچائے۔ تمہیں ہر وہ چیز دے جس کی تمہیں کبھی خواہش ہو۔

تمہارا خط مجھے دو دن پہلے ملا ہے حسب معمول تم نے مجھے بہت سے مشورے' بہت سی نصیحتیں کی ہیں۔ مریم! اب مجھے کسی مشورے کسی نصیحت کی ضرورت نہیں رہی۔ مجھے دلدل سے باہر نکلنے کا طریقہ آ گیا ہے۔ مجھے بھول بھلیوں سے باہر نکلنے کا راستہ نظر آ گیا ہے۔ لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ میں تمہیں اس راستے کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ میں اپنی ذات کے بارے میں بنائے گئے تمہارے تاج محل کو تاش کے پتوں کی طرح گرنے نہیں دینا چاہتی۔

آج میں اپنی الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھ رہی تھی۔ بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو میں نے خرید کر لانے کے باوجود نہیں پڑھیں۔ اور بہت سی ایسی ہیں جو آدھی پڑھ کر رکھ دیں۔ مجھے خیال آیا تھا کہ ہم کتابیں کیوں پڑھتے ہیں؟ اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لیے ہے نا اور یہ علم کیا دیتا ہے آگہی اور یہی آگہی پورے وجود کو اندر سے لہولہان کرتی رہتی ہے۔ جتنا علم ہمیں زندگی دیتی ہے۔ کیا وہ کافی نہیں ہے۔ ہم کیوں کتابیں خرید خرید کر آگہی کے اس عذاب میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ کتابیں چیزوں تک پہنچنے کا رستہ دکھاتی ہیں۔ منزل تک نہیں پہنچاتیں۔ یاد ہے ناں تم مجھے تحفے کے طور پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب ہی دیتی تھیں۔ آج میں نے وہ ساری کتابیں نکال کر دیکھی ہیں' وہ ساری باتیں پڑھی ہیں جو تم نے ان پر میرے لیے لکھی تھیں۔

مریم! تم جانتی ہو میں نے عاشر عثمان کے علاوہ کسی سے محبت نہیں کی۔ میں تو کسی

دوسرے سے محبت کے قابل ہی نہیں رہی۔ لوگ جس سے محبت کرتے ہیں۔ اس پر اپنی جان تک نچھاور کر دیتے ہیں۔ میں نے جس سے محبت کی ہے' اسے سولی پر لٹکا دیا ہے۔ نہ وہ زندہ رہے نہ وہ مرے۔ سب سے زیادہ تکلیف' نا امیدی نہیں دیتی بلکہ امید اور نا امیدی کے درمیان والی حالت دیتی ہے اور میں نے پچھلے ڈیڑھ سال سے عاشر عثمان کو اسی حالت میں رکھا ہوا ہے۔

پھر سبط علی ہے۔ سید سبط علی گیلانی جس سے مجھے محبت ہے نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ جسے مجھ سے محبت ہے نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ مگر پھر بھی ...... پھر بھی اگلے ماہ آج سے پورے چھبیس دن بعد اس سے میری شادی طے کر دی گئی ہے۔

شادی کر لوں تو در نجف اجڑ جائے گی۔ سبط علی برباد ہو جائے گا۔ عاشر عثمان کا ہمیشہ کے لیے عورت کے وجود سے اعتبار اٹھ جائے گا اور خود میں سیدہ در مکنون ساری عمر آوازوں اور چہروں کے جنگل میں سرگشتی پھروں گی۔

اور اگر میں سبط علی سے شادی نہ کروں تو عاشر عثمان اپنی ساری زندگی امید اور ناامیدی کی اسی صلیب پر لٹکتے ہوئے گزار دے گا۔ اور میں ساری عمر اسی حویلی کے ویران دالانوں اور برآمدوں میں کسی بدروح کی طرح چکراتی پھروں گی۔ مجھے بڑھاپے سے خوف نہیں آتا مریم! مگر تنہائی سے آتا ہے۔ سناٹا اور ویرانہ میرے وجود کو مٹی کا ایک بھربھرا ڈھیلا بنا دیں گے۔

میں اپنی پھوپھو کی طرح لمبے سفید چوغے والی بدروح بننا نہیں چاہتی۔ جو سارا دن کسی رئیس کی طرح لوگوں کو تسلیاں اور دلاسے بانٹتی ہے۔ اور رات کو کسی فقیر کی طرح آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ان ہی دونوں چیزوں کی بھیک مانگتی ہے۔ مگر ہر بار آئینہ اسے ایک نیا سفید بال اور چہرے پر پڑی ہوئی ایک نئی جھری کچھ اور سناٹے کے ساتھ بخش جاتا ہے۔ پھر وہ دوپٹے سے بے نیاز کسی پاگل کی طرح کمرے کے چکر کاٹ کاٹ کر وظیفے پڑھتی جاتی ہے۔

شاید وہ وظیفے انہیں سکون بخشتے ہوں گے۔ انہیں کوئی امید دلاتے ہوں گے مگر مجھے کوئی وظیفہ سکون دے سکتا ہے نہ امید۔ ان کی زندگی میں کبھی کوئی عاشر عثمان نہیں رہا اور

میری زندگی میں عاشر عثمان ہی تو ہے۔

مریم! تم نے لکھا ہے کہ اگر میں عاشر عثمان کے بغیر نہیں رہ سکتی تو پھر اس سے شادی کرلوں۔ ماں باپ کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر' ان کی رضامندی حاصل کیے بغیر۔

مریم! میں یہ بھی نہیں کر سکتی۔ آئندہ آنے والی نسلوں تک میرے ماں باپ اور میں خاندان کی لعنت و ملامت کا شکار رہیں گے۔ مجھے ماں باپ کی بددعاؤں سے بڑا خوف آتا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں اپنے باپ کے کندھے پر رکھی چادر کو چھین کر دور پھینک دوں۔

اس خاندان میں دوبارہ کبھی کسی لڑکی کو سکول کی شکل دیکھنے نہیں دی جائے گی۔ میں برداشت نہیں کر سکتی۔ کوئی میرے بابا کو بیٹی کا طعنہ دے۔ کوئی یہ کہے کہ "دیکھ لیا تعلیم کے لیے گھر سے باہر نکالنے کا نتیجہ اب بھگتو۔"

میں ہنس رہی ہوں مریم! میں بہت ہنس رہی ہوں۔ کل تک میں سوچ رہی تھی کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ ساری عمر کے لیے کنوارا رہنا' عاشر کے ساتھ پسند کی شادی یا سبط علی کے ساتھ شادی کے علاوہ میرے پاس کوئی چوتھا رستہ ہے ہی نہیں۔ مگر چوتھا رستہ بھی تھا اور ہے بعض دفعہ ہمیں بہت سامنے کی چیزیں نظر نہیں آتیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اگر چوتھا رستہ پہلے نظر آ جاتا۔ تو یہ پچھلے ڈیڑھ سال کی اذیت کا سامنا نہ کرنا پڑتا نہ تمہیں ہر ماہ میرا خط پڑھ کر اس طرح آنسو بہانے پڑتے جس طرح تم نے پچھلے ماہ فون پر بہائے تھے۔

مریم! میں نے تم سے بہت محبت کی ہے مریم! میں نے تو کبھی بھی کسی سے نفرت نہیں کی۔ حتیٰ کہ بابا سے بھی نہیں۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں عاشر عثمان کے علاوہ کسی اور کے دل میں میرے لیے رحم کیوں نہیں ہے۔ بابا کو تو سوچنا چاہیے تھا۔ صرف تعلیم کی آزادی تو آزادی نہیں ہے۔ یہ تو پیاسے کو سراب دکھانے کے مترادف ہے۔ تعلیم دیتے ہیں۔ حق نہیں دیتے۔ پانی دکھاتے ہیں پلاتے نہیں۔ اہل سادات بیٹیوں کو عزت دیتے ہیں۔ محبت دیتے ہیں۔ مگر گھر بسانے نہیں دیتے۔ جس پیغمبر کی ہم آل ہونے کے دعوے دار ہیں انہوں نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔ انہوںؐ نے تو عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں رکھا تھا۔ پھر آل رسولؐ نے یہ چھوت چھات اپنی بیٹیوں کا مقدر کیوں بنا دی۔ میں سیدہ درمکنون علی عباس رضوی ہوں تو

اس میں میرا کیا کمال ہے۔ وہ صرف عاشر عثمان ہے۔ تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ اسے اسی خدا نے بنایا ہے۔ جس نے محمدؐ کو رسول بنایا۔

بائیس سال تک میں بھی نام و نسب اور مرتبہ کے اسی فخر میں مبتلا رہی پھر ہاں پھر میری زندگی میں عاشر عثمان آ گیا۔ اور وہ فخر ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گیا۔ پتا ہے مریم! آج مجھے اپنا وجود کیکٹس کا پودا لگ رہا ہے۔ جس نے دوسروں کو تکلیف پہنچانے کے لیے' ان کے ہاتھ زخمی کرنے کے لیے کیسے کیسے کانٹے اگائے ہوتے ہیں۔ ہم نے بھی تو ایسے ہی کانٹے اپنے وجود پر اگا رکھے ہیں۔ کوئی نام و نسب کا کانٹا۔ کوئی مال و جاہ کا کانٹا۔ کوئی حسن و خوبصورتی کا کانٹا اور ہر کانٹا ہاتھ کو نہیں روح کو چھید کر رکھ دیتا ہے۔

مریم! میری ہر غلطی کو معاف کر دینا۔ تم تو ہمیشہ ہی معاف کر دیتی ہو اور مجھے ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ میں خدا سے ایک بار پھر دعا گو ہوں کہ وہ تمہیں بہت سی خوشیاں دے۔ تمہیں ہمیشہ بہت پُرسکون رکھے۔ میری طرف سے بلال کو ڈھیروں پیار کرنا۔

خدا حافظ

تمہاری دوست

سیدہ درمکنون علی عباس رضوی

31 دسمبر

لاہور (نمائندہ خصوصی) کل ایک مقامی سرکاری ہاسپٹل میں ہاؤس جاب کرنے والی ایک لیڈی ڈاکٹر پراسرار حالت میں مردہ پائی گئی۔ متوفیہ کا نام سیدہ درمکنون علی عباس رضوی بتایا جاتا ہے۔ ہمارے نمائندہ کی اطلاع کے مطابق متوفیہ جنوبی پنجاب کے ایک بہت معزز مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ تفصیلات کے مطابق متوفیہ 29 دسمبر کی رات کو نائٹ شفٹ کے بعد حسب معمول واپس ہاسٹل آئی اور صبح نو بجے کے قریب چوکیدار کو ایک خط پوسٹ کرنے کے لیے دے کر میٹرن کو یہ کہہ کر واپس کمرے میں چلی گئی کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔ اور وہ آرام کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ لیکن جب شام دیر تک وہ دوبارہ اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی تو میٹرن نے بار بار دروازہ بجایا

اور دروازہ نہ کھولنے پر جب چوکیدار اور کچھ دوسرے ملازموں کے ذریعے دروازہ توڑا تو اندر متوفیہ کی لاش پڑی تھی۔ گھر والوں کو اطلاع دی گئی تو وہ زبردستی لاش لے گئے اور پوسٹ مارٹم نہیں کرنے دیا۔

متوفیہ کے سامان اور کمرے کی تلاشی لینے پر پولیس کو کچھ ڈائریز اور ایسے ثبوت ملے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ متوفیہ اپنی مرضی سے کہیں شادی کرنا چاہتی تھی اور اس معاملے پر والدین سے اس کے تعلقات کشیدہ چلے آ رہے تھے۔

پولیس نے اس سلسلے میں جب متوفیہ کے خاندان سے رابطہ کیا تو انہوں نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔

متوفیہ کے کمرے کی ایک کھڑکی کے شیشے پر یہ عبارت تحریر تھی۔ ”زندگی گندی ہے“ پولیس نے خودکشی کا مقدمہ درج کر کے تحقیقات شروع کر دی ہیں۔

☆......☆

”بس یار! یہ پڑھی لکھی لڑکیوں کے بڑے چکر ہوتے ہیں بندہ پوچھے تمہیں ماں باپ نے پڑھنے بھیجا ہے پڑھو۔ پڑھائی چھوڑ کر آوارہ قسم کے لڑکوں کے ساتھ چکر شروع کر دیتی ہیں۔ پھر ماں باپ انہیں کے فائدے اور بھلے کی خاطر آوارہ قسم کے لڑکوں سے شادی کرنے نہیں دیتے اور یہ اس طرح خاندان کا نام بدنام کرتی پھرتی ہیں۔ اب ذرا سوچو کتنا روپیہ لگایا حکومت نے اس لڑکی کو ڈاکٹر بنانے پر اور اس نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ اسے دوسروں کے علاج سے زیادہ اپنی شادی کی پڑ گئی تھی۔“

لائبریری میں لڑکیاں بلند آواز سے اسی ایک خبر پر تبصرے کر رہی تھیں اور سیدہ حنا مغیث ہاشمی زرد چہرے کے ساتھ اخبار ہاتھ میں لیے یک ٹک ایک لائن کو دیکھتی جا رہی تھی۔

”زندگی گندی ہے۔“

لائبریری میں آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کے دماغ میں سناٹا پھیلتا جا رہا تھا۔